جہادی حکمت عملی: مثبت اور منفی پہلو

(۱)

کشمیر کے محاذ پر کل کیا ہونے والا ہے، اس کی تفصیلات ابھی پردۂ غیب میں ہیں لیکن اب تک کیا ہو چکا، اس باب میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ ۸۹۔۱۹۸۸ء میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی تھی، اس کی صفیں اب لپیٹی جا رہی ہیں۔ گزشتہ پندرہ سالوں میں جو کچھ ہوا، اس کا قرض ان لوگوں کے ذمے ہے جنھوں نے یہ ساری حکمت عملی ترتیب دی اور جوان کے دست و بازو بنے۔ ہمارے ہاں چونکہ خود احتسابی کی کوئی روایت نہیں، اس لیے یہ امکان تو موجود نہیں کہ یہاں کوئی تحقیقاتی کمیشن بنے جو اس ناکامی کے اسباب کو موضوع بنائے لیکن ایک احتساب بہرحال اللہ کی عدالت میں ہونا ہے۔ اب یہ ان لوگوں کو سوچنا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور میں کیا عذر پیش کریں گے۔ سردست ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نئی تبدیلی کے منفی اثرات سے اپنی قوم کو کیسے محفوظ رکھا جائے اور جو لوگ پورے اخلاص اور ایک دینی احساس کے ساتھ دامے، درمے، سخنے اس عمل میں شریک رہے ہیں، کسی نفسیاتی حادثے کا شکار نہ ہوں اور ان کی صلاحیتیں کوئی مثبت رخ اختیار کریں۔

پہلا کام جو ناگزیر ہے، وہ یہ ہے کہ جہاد کشمیر کے نام پر عامۃ الناس کے جذباتی استحصال کا سلسلہ اب رک جانا چاہیے۔ اس عنوان سے ہم نے بہت سی زندگیاں برباد کیں۔ ہمارے گھر اور مال تو محفوظ رہے لیکن ہم نے بہت سے گھروں پر دکھ کی چادر ہمیشہ کے لیے تان دی اور انھیں کوئی خوشی نہیں دے سکے۔ اپنے مذہبی راہ نماؤں سے میری درخواست ہے کہ وہ جہاد کشمیر کے نام پر اب اس قوم کے نوجوانوں کو بہکانے کا سلسلہ ازراہ کرم بند کر دیں۔ ان کی یہ بڑی خدمت ہوگی اگر وہ اس سارے معاملے کے بارے میں قوم کی صحیح راہنمائی کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ اس وقت ان کے کرنے کے کام دوسرے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو اس جانب متوجہ کریں کہ وہ تعلیم اور ہنر کے ذریعے اپنی تعمیر کریں۔ اس محاذ پر اپنی توانائیاں صرف کریں جہاں ان کی کامیابی یقینی ہے اور خود فطرت کے قانون کے تحت جس محاذ پر ان کی پیش قدمی کو روکنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

میں جانتا ہوں یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ ''جہاد'' اب ختم ہو

چکا، ہم نے اگر ''مجاہدین'' کی تیاری کا کام جاری رکھا تو ہم اس قوم کے مجرم ہوں گے اور اللہ کے حضور میں بھی ہمارا کوئی عذر، مجھے ڈر ہے کہ شاید قبول نہ ہو۔ میری خوش گمانی ہے کہ ہماری مذہبی قیادت میں سے اکثر حضرات نے ایک نیک جذبے اور اللہ کی رضا کے لیے اس عمل کا ساتھ دیا لیکن اب صورت حال کی تبدیلی کے بعد اللہ کی رضا ہی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانتے بوجھتے لوگوں کو ایک آگ میں نہ جھونکیں۔ حکومت کو وہ مطعون کر سکتے ہیں کہ اس نے کیوں اس حکمت عملی پر نظر ثانی کی لیکن عوام کو صحیح صورت حال کے مطابق تیار کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، تو یہاں بھی مذہبی قیادت کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے پاس اب کیا راستہ باقی تھا؟ میں ان کالموں میں متعدد بار یہ بات دہرا چکا ہوں کہ دنیا میں آج کسی مسلح جدوجہد کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ ۹ ستمبر کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسے نوعیت کی کوئی سرگرمی نتیجہ خیز ہو سکتی ہے تو اسے کسی نفسیاتی معالج کے پاس جانا چاہیے۔ یہاں معاملہ صحیح یا غلط کا نہیں، زمینی تبدیلیوں کے ادراک کا ہے۔ دنیا میں آنے والی تبدیلیاں یہ بتاتی ہیں کہ کسی صحیح مقصد کے لیے بھی اگر پر تشدد طریقے اختیار کیے جائیں گے تو ایسے کسی عمل کو عالمی سطح پر کوئی تائید حاصل نہیں ہوگی۔ ضرورت ہے کہ ہماری مذہبی قیادت بھی اس تبدیلی کا ادراک کرے اور اپنے متاثرین کی تربیت نئی نہج پر کرے جس میں اس تبدیلی کی رعایت رکھی گئی ہو۔

دوسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ جو لوگ اتنے سالوں سے پورے اخلاص کے ساتھ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس عمل کو آگے بڑھاتے رہے ہیں، ان کی واپسی کا محفوظ راستہ تلاش کیا جائے۔ یہ کام حکومت اور مذہبی جماعتوں کو مل کر کرنا ہوگا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ فوج کے معاون ادارے کے طور پر ایک نیا ادارہ قائم کرے جس میں ان تربیت یافتہ نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔ ان کی تنخواہوں اور ملازمت کا ایک باقاعدہ نظام ہو۔ جہاد کشمیر کے نام پر جو کروڑوں روپے جمع کیے گئے ہیں، وہ اس ادارے کو دے دیے جائیں۔ اس ادارے کو مختلف خدمات سونپ دی جائیں، جیسے تعلیمی اداروں میں این سی سی کی ٹریننگ، حادثات کی صورت میں لوگوں کی مدد، شہری دفاع کی تربیت اور اس نوعیت کے دیگر کام۔ اس طرح یہ امکان ختم ہو جائے گا کہ ان نوجوانوں کو کوئی غیر حکومتی یا عسکری تنظیم اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے اور اس سے معاشرے میں بدامنی اور فساد پیدا ہو۔

اس عمل میں مقبوضہ کشمیر کے جو لوگ شریک ہیں، ان کی واپسی کے بارے میں بھی ہمیں سوچنا ہوگا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاملے میں بھارتی حکومت سے بات کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جائیں اور بھارت ان سے کسی نوعیت کی باز پرس نہ کرے، تاکہ یہ لوگ وہاں اپنی معمول کی زندگی دوبارہ شروع کر سکیں۔ میرے نزدیک کشمیریوں کے جان و مال کے مزید ضیاع کو روکنا ہماری ذمہ داری ہے اور اس مرحلے پر جب یہ صفیں لپیٹی جا رہی ہیں، ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مقبوضہ کشمیر کے جو لوگ اس سارے عمل میں ہمارے ساتھ شریک رہے ہیں، ان کا مستقبل محفوظ ہو۔

تیسرا کام ان اثرات کا جائزہ ہے جو جہاد کے عمل کو نجی تحویل میں دے دینے سے مرتب ہوئے ہیں۔ ہمیں اس

پر پوری سنجیدگی سے غور وفکر کرنا ہوگا کہ کسی دوسرے ملک یا قوم کے خلاف ہم نے جہاد کو جس طرح غیر حکومتی سطح پر منظم کیا، اس کے اثرات خود ہمارے معاشرے پر کیا مرتب ہوئے؟ یہ بات بھی میں بارہا لکھ چکا کہ اسلام میں نجی جہاد کا کوئی تصور نہیں۔ جہاد ہمیشہ ریاست اور حکومت کے اہتمام میں ہوتا ہے اور حکومت بھی یہ کام کسی خفیہ طریقے سے نہیں بلکہ علانیہ کرنے کی پابند ہے۔ ہم نے اس اصول سے انحراف کیا اور نیا اجتہاد کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی غیر محفوظ ہو گیا اور بدامنی نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ جب جہاد نجی تحویل میں گیا تو یہ حق بھی مختلف تنظیموں کو منتقل ہو گیا کہ وہ اپنے طور پر یہ طے کریں کہ دین کا دشمن کون ہے۔ کسی کے نزدیک یہ دشمن خارج میں ہے اور کسی نے اسے اپنے ملک میں تلاش کیا۔ اس کے جو معاشرتی اثرات مرتب ہوئے، اس کو ہم سب بچشم سر دیکھ رہے ہیں۔ آج اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم غور کریں اور اس کو سنجیدہ بحث کا موضوع بنائیں کہ منظم فوج کی موجودگی میں جب افغانستان اور کشمیر کے تناظر میں ہم نے جہاد کو نجی تحویل میں دیا تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

کشمیر کے محاذ پر آج جب ہم اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کر رہے ہیں، یہ تین کام ہمیں کرنا ہوں گے۔ حکمت عملی کی تبدیلی اقوام کی زندگی میں کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قوم اس کے بارے میں باخبر ہو اور یہ جانتی ہو کہ اب اس کو کیا کرنا ہے۔ قوم کو اس معاملے میں کسی نئے انتشار فکر سے بچانا اب حکومت اور اس سے زیادہ ہماری مذہبی قیادت کی ذمہ داری ہے۔

(خورشید احمد ندیم، روزنامہ جنگ، لاہور)

(۲)

جناب خورشید احمد ندیم ہمارے محترم اور فاضل دوست ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم ودانش کی دولت سے نوازا ہے اور وہ اپنے کالموں کے ذریعے اس میں ہم نیاز مندوں کو بھی شریک کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کی حالت زار پر اضطراب اور بے چینی کے نئے پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے اور فطری طور پر بعض معاملات میں اختلاف رائے بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کا اظہار بسا اوقات ضروری محسوس ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے حال ہی میں کشمیر کے حوالے سے حکومت پاکستان کی حکمت عملی میں نظر آنے والی تبدیلیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ افغانستان اور کشمیر میں جہاد کے نام پر جو جدوجہد گزشتہ دو عشروں میں جاری رہی ہے، وہ ناکام ہو گئی ہے، اس کا آغاز ہی غلط تھا، یہ محض جذبات پر مبنی تھی اور ملک کی مذہبی قیادت کو اس حکمت عملی کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے طرز عمل اور طریقہ کار کو تبدیل کرنا چاہیے۔ انھیں اس بات پر بھی اصرار ہے کہ اس طریق کار کا مسئلہ کشمیر کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہوا ہے اور چونکہ یہ حکومتی اور ریاستی سطح کے بجائے پرائیویٹ طور پر نجی جماعتوں اور افراد نے شروع کی تھی، اس لیے ان کے نزدیک اس کا شرعی جواز بھی موجود نہیں تھا۔

ہمیں محترم ندیم صاحب کی ان دونوں باتوں سے اختلاف ہے۔ جہاں تک جہادی حکمت عملی کے ناکام ہونے

کا تعلق ہے، اگر کسی تحریک کے صرف معروضی حالات اور محض وقتی نتائج دیکھ کر فیصلہ کر لینا ہی عقل و دانش کا تقاضا ہے تو ان کا یہ ارشاد کسی حد تک قرین قیاس لگتا ہے، لیکن اگر تحریکات کو ان کے تاریخی تسلسل اور دور رس نتائج کی روشنی میں دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے تو پھر ہم بصد ادب گزارش کریں گے کہ افغانستان اور کشمیر میں جہادی تحریکات کے بارے میں محترم خورشید احمد ندیم کا یہ تجزیہ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ہمارے ہاں یہ روایت بن گئی ہے کہ کسی جدوجہد اور تحریک کی وقتی پسپائی کو دیکھ کر اس کی ناکامی کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے، حالانکہ جدوجہد اگر جاری ہے اور تحریک کی قیادت خود شکست قبول نہ کرے تو اس کی ناکامیاں بھی آخر کامیابی کا زینہ ہوتی ہیں۔ محمود غزنوی نے سومنات پر سترھویں حملے میں کامیابی حاصل کی تھی جبکہ اس کے پہلے سولہ حملوں کے بارے میں تاریخ یہ کہتی ہے کہ اگر وہ آخری حملے سے قبل ہتھیار ڈال دیتا اور شکست قبول کر کے گھر بیٹھ جاتا تو یہ سولہ حملے ناکامی ہی کے زمرے میں آتے، لیکن اس کے عزم و استقلال کے تسلسل اور جنگ جاری رکھنے کے عزم نے ان سولہ حملوں کو اس کے آخری اور کامیاب حملے کا زینہ بنا دیا تھا۔ ہمارے ہاں تحریک خلافت کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ ناکام ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ خلافت ترکی کا مسئلہ تھا، اس پھڈے میں شریک ہونا دوسروں کی آگ میں ہاتھ ڈالنا تھا اور محض جذباتیت تھی، جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ خلافت ترکی کا نہیں، عالم اسلام کا مسئلہ تھا اور جناب نبی اکرم ﷺ نے ملت اسلامی کو ''جسد واحد'' سے تشبیہ دے کر اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ جسم کا ایک حصہ تکلیف محسوس کرے تو دوسرا حصہ خود بخود اسے محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ملت اسلامیہ کے مسائل پاکستان، مصر، انڈونیشیا، سوڈان اور سعودی عرب کے جغرافیائی حوالوں سے نہیں بلکہ عالم اسلام کے اجتماعی ماحول اور ضروریات کے حوالے سے ہیں اور اگر ملت اسلامیہ کے کسی ایک حصے کے مسئلے اور تکلیف کو دوسرا حصہ محسوس نہیں کرتا اور اس کے ازالے میں اپنا کردار ادا نہیں کرتا تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آنکھ کو تکلیف ہو اور پاؤں یہ کہہ کر ڈاکٹر کی طرف جانے سے انکار کر دیں کہ ہمیں تو کوئی تکلیف نہیں ہے، ہم کیوں آنکھ کی خاطر چلنے کی زحمت اٹھائیں۔

پھر تحریک خلافت ناکام نہیں ہوئی، بلکہ اس نے برصغیر کے مسلمانوں میں آزادی کے احساس اور جذبے کو بیدار کیا اور آزادی کی تحریکات کو نیا خون دیا۔ آپ تحریک خلافت کے بعد کی سیاسی تحریکات کو دیکھ لیجیے، وہ کانگریس ہو، مسلم لیگ ہو، مجلس احرار اسلام ہو یا جمعیت علماے ہند، ان میں سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں کی ایک بڑی کھیپ تحریک خلافت ہی نے مہیا کی تھی اور اس طرح تحریک خلافت نے جنوبی ایشیا میں آزادی کی تازہ دم تحریکات کے لیے نرسری کا کام دیا تھا، اس لیے یہ کہنا کہ تحریک خلافت ناکام ہو گئی، برصغیر کی سیاسی جدوجہد کے تسلسل سے بے خبری کی علامت ہے۔ اسی طرح تحریک کشمیر میں جہادی جدوجہد کی صورت حال ہے، اور دو باتیں تو نقد نتائج کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں:

آزاد کشمیر کے نام سے جو خطہ اس وقت ہمارے ساتھ ہے، بلکہ گلگت، بلتستان اور سکردو پر مشتمل شمالی علاقہ جات کی پٹی کی آزادی بھی جہادی عمل ہی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اسے جہاد کے باقاعدہ اور پرائیویٹ فتوے کی بنیاد پر ہی مجاہدین